ولی کی عظمت و اولیت

ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی

زبیدہ ڈگری کالج، جےنگر، پوسٹ بکس نمبر 6، شکاری پور، شیموگہ (کرناٹک) موبائل: 9945462187

اردوئے قدیم کے کئی شعرا کی طرح ولی کی زندگی کے تفصیلی حالات اب تک معلوم نہیں ہو سکے ہیں۔ اس کے باوجود مطالعۂ ولی کے در کھلے ہوئے ہیں، کیوں کہ کسی بھی فنکار کی شناخت اس کے فن سے ہوتی ہے۔ نہ کہ اس کے خاندانی حالات اور نجی زندگی کے واقعات سے۔

ہم جانتے ہیں کہ ایک زمانے تک ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا رہا ہے، مگر تحقیق و تنقید نے علم و ادب کی کئی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھا دیا اور کئی پس پشت پڑے شعرا و ادبا کو سامنے لا کر بٹھا دیا اور واضح کر دیا کہ ولی اردو کے پہلے شاعر نہیں ہیں، مگر یہ خیال آج بھی اتنا ہی درست ہے کہ ولی نہ صرف دکن کے بلکہ اردو کے پہلے اہم اور بڑے شاعر ہیں کیوں کہ ان کے یہاں زبان و بیان کی نفاست سے لے کر شعری لطافت تک کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ انہی کے فن سے شمالی ہند میں اردو شاعری کا چراغ روشن ہوا۔

ولی کے بارے میں دکنی اور گجراتی ہونے کا جھگڑا آج تک جاری ہے کیوں کہ ان کی ابتدائی زندگی کے بارے میں جس قدر معلومات حاصل ہو سکی ہیں ان پر علماء ادب پوری طرح متفق نہیں ہیں۔ سچ تو یہ بھی ہے کہ چند دہائی پہلے تک تو لوگ ولی کے بارے میں بعض بنیادی باتیں بھی نہ جانتے تھے حتیٰ کہ ان کی تعلیم و تربیت، گھر خاندان اور والدین کے بارے میں بھی کوئی ٹھوس معلومات نہیں تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر سید احتشام حسین نے اپنی کتاب ''اردو ادب کی تنقیدی تاریخ'' میں اس طرح کی کسی چیز کا ذکر نہیں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ابھی کچھ دن پہلے تک ولی کے بارے میں بھی بہت تھوڑی سی معلومات ملتی تھیں مگر اب جو تحقیقی کام ہوئے ہیں ان کی وجہ سے ان کے نام، جائے پیدائش، وفات وغیرہ کی نسبت کچھ باتیں معلوم ہو گئی ہیں۔ حالانکہ ان کے دکنی یا گجراتی ہونے کی بحث اب بھی ختم نہیں ہوئی۔

احتشام صاحب کے اس اقتباس سے واضح ہے کہ وہ جن چیزوں کے معلوم ہو جانے کا ذکر کر رہے ہیں ان پر خود ان کو اعتبار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ولی دکنی کا نام اور ان کی جائے پیدائش کے بارے میں کچھ نہیں لکھتے ہیں اور یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ دکنی اور گجراتی کا معاملہ اب بھی زیر بحث ہے۔

بہر حال بعد میں چند لوگوں نے ولی پر بہت گرانقدر کام کیا اور بہت سی معلومات فراہم کیں اور تسلیم کر لیا گیا کہ ولی کا نام ولی محمد تھا اور ان کے والد کا نام مولانا شریف محمد تھا جو گجرات کے مشہور بزرگ شاہ وجیہ الدین کے بھائی شاہ نصر اللہ کی اولاد میں سے تھے۔ ولی ۱۶۴۹ء سے قبل اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ یہ بات حیرت انگیز کہی جائے گی کہ ان کی جائے پیدائش کے بارے میں قیاس آرائی کے باوجود یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کی ابتدائی تعلیم کہاں ہوئی۔ البتہ یہ بات متفقہ طور پر مان لی گئی ہے کہ ولی کو حصول علم کا بہت شوق تھا اسی شوق کی تکمیل کے لیے انہوں نے احمد آباد سے نکل کر سورت، دلی اور گجرات وغیرہ کا سفر کیا اور عالموں، صوفیوں اور دیگر اہل علم حضرات سے مل کر اپنی علمی پیاس بجھائی۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی لکھتے ہیں:

''ولی نے احمد آباد میں شاہ وجیہ الدین کی خانقاہ کے مدرسے میں تعلیم پائی اور وہیں شاہ نور الدین صدیقی سہروردی کے مرید ہو گئے۔''

(نور الحسن ہاشمی، مقدمہ کلیات ولی، ص:۱۱)

نور الحسن کی فراہم کردہ معلومات کی تائید کلام ولی سے بھی ہوتی ہے اور دوسرے دانشوروں کے اقوال سے بھی ظہیر الدین مدنی لکھتے ہیں:

''اس کی شخصیت جامع کمالات تھی وہ اپنے ادبی کارناموں میں کسی جگہ عالم و فاضل مصلح و مشیر صوفی و صافی کی حیثیت سے رونما ہوتا ہے اور کہیں ادیب و انشا پرداز اور مجتہد العصر دکھائی دیتا ہے۔''

ولی کی شاعری میں جا بجا قرآن و احادیث سے متعلق واقعات کا عکس بکھرا پڑا ہے۔ وہ اپنے وقت کے بیشتر مروج علوم سے واقف تھے اور تصوف میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کے متنوع رنگوں میں تصوف کا رنگ بھی شامل ہے اور غالباً تصوف نے ہی انہیں حسن شناس و حسن پرست بنایا تھا اور سیر و سیاحت جس کا ولی کو بہت شوق تھا، نے مسائل حیات سے واقف کرایا اور زندگی کے مختلف رنگوں کا شعور و ادراک بخشا۔ ولی نے حج بیت اللہ کا شرف بھی حاصل کیا تھا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ اسی سلسلے میں سورت گئے تھے۔ کیوں کہ اس زمانے میں حج کو جانے کے لیے سورت ایک اہم راستہ تھا، لیکن ان کی سیر و سیاحت اور اسفار میں دلّی کے سفر کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ کیوں کہ اسی سفر نے انہیں اردو شاعری کے باوا آدم کے طور پر لوگوں سے متعارف کرایا

اور شمالی ہند میں اردو شاعری اور ادبی تاریخ کا نیا باب کھلا۔ دہلی کا یہ سفر انہوں نے ۱۷۰۰ء میں اپنے دوست سید ابوالمعالی کے ساتھ کیا۔ جب وہ دلّی پہنچے تو وہاں کے مشہور صوفی شاعر سعداللہ گلشن سے بھی ملے جو پہلے ہی سے ان کے لیے مرشد کی سی حیثیت رکھتے تھے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ولی نے سعداللہ گلشن ہی کے کہنے پر فارسی افکار و خیالات کو اردو شاعری کے قالب میں ڈھالنے کا کام کیا اس سلسلے میں میر تقی میر کا نام لیا جاتا ہے جنہوں نے نکات الشعرا میں لکھا ہے:

''ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند در ریختہ خود بکار۔''

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا ولی کی عظمت کا راز محض اس بات میں مضمر ہے کہ انہوں نے فارسی میں بیکار پڑے افکار و خیالات کو اردو الفاظ کا جامہ پہنا دیا۔ جب کہ دوسرا سوال اس سے بھی مشکل ہے۔ یعنی کیا یہ ممکن ہے کہ ایک شخص دوسرے کے افکار و خیالات کو اپنے الفاظ میں پیش کر کے بڑا شاعر بن جائے۔ وہ بھی اتنا بڑا کہ صدیوں تک لوگوں کو متاثر کرتا رہے؟ جواب یقیناً نفی میں ہوگا مگر ان سوالوں پر رک کر یہاں تفصیلی گفتگو ممکن نہیں ہے۔ آیئے پہلے ہم یہ دیکھ لیں کہ ولی کے بارے میں تذکرہ نگاروں، ہم عصر شعرا اور بعد کے ناقد کیا رائے رکھتے ہیں اور یہ بھی کہ خود ولی اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ ولی کی عظمت کا اعتراف صرف ان کے ہمعصروں نے ہی نہیں کیا ہے۔ بلکہ ہر عہد کے بڑے سے بڑے ناقد نے ان کی عظمت کا اقرار کیا ہے۔

مصحفی اپنے تذکرہ ہندی میں لکھتے ہیں:

''جب ولی کا دیوان جلوس محمد شاہی کے دوسرے سال میں دلّی پہنچا اور وہاں کے شعرا نے اس میں وہ رنگ و نور دیکھا جس کے دیکھنے کو ان کی آنکھیں ترستی تھیں تو انہوں نے بھی فارسی کو چھوڑ کر اسی رنگ سخن کی پیروی شروع کر دی۔''

میر حسن نے ''تذکرہ شعرائے ہندی'' میں ریختہ کی اولیت کا سہرا ولی کے سر باندھا ہے اور انہی کو اس فن کا استاد کامل اور استاد اول قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''ابتدائے ریختہ از اوست اول استادی ایں فن بنام اوست''

محمد حسین آزاد جن کی کتاب ''آب حیات'' تذکرہ نگاری اور تنقیدی تاریخ کی درمیانی کڑی کی سی حیثیت رکھتی ہے اور اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے تحقیق و تنقید کے اتنا آگے نکل جانے کے باوجود قابل استفادہ سمجھی جاتی ہے، اس میں لکھتے ہیں:

''جب ان کا دیوان دلّی پہنچا تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا، قدر دانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا، لذت نے زبان سے پڑھا گیت موقوف ہو گئے، قوال معرفت کی محفل میں انہی کی غزلیں گانے اور بجانے لگے، ارباب نشاط یاروں کو سنانے لگے جو طبیعت موزوں رکھتے تھے انہیں دیوان بنانے کا شوق ہوا۔''

محمد حسین آزاد کے اس اقتباس سے واضح ہے کہ ولی کی شاعری نے تمام لوگوں کو مسحور کر دیا اور دلّی فتح کر لی۔ یہی وجہ تھی کہ قوال بھی ان کی غزلیں گانے پر مجبور ہو گئے۔ حد یہ کہ ولی کی غزلوں نے گیتوں کی مقبولیت کو بھی مات دے دیا۔ گویا ولی کی شاعری میں عوامی حسیت کو انگیخت کرنے کے علاوہ ثقافت کی روح کو معطر کرنے کی خوبی بھی پائی جاتی ہے۔ اسی لیے دکن سے شمال تک ولی کا ڈنکا بجنے لگا اور بات بھی کچھ یوں ہے کہ اردو شاعری اپنی جن خوبیوں اور فنی لوازم کے لیے جانی جاتی ہے اور جس طرح کے تلازموں اور صنعتوں کے لیے ممتاز سمجھی جاتی ہے وہ تمام چیزیں ولی کی شاعری میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں اردو کا عبقری فنکار قرار دیا جاتا ہے۔ نورالحسن ہاشمی جنہیں ماہر ولی کے طور پر بھی یاد کیا جاتا ہے اپنی کتاب ''ہندوستانی ادب کے معمار۔ ولی'' کے پہلے باب کے آغاز میں لکھتے ہیں:

''ولی کا موازنہ اکثر چاسر سے کیا جاتا ہے کیوں کہ ولی نے اردو شاعری کو فروغ دینے میں اسی طرح کامیابی حاصل کی جس طرح چاسر نے انگریزی کے فروغ دینے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ یعنی انہوں نے ایسا طریقۂ بیان ایسے لسانی انداز کے ساتھ وضع کیا جو نہ صرف دکن بلکہ شمالی ہند میں بھی قابل قبول سمجھا گیا۔''

ولی کو چاسر کا ہم پلّہ قرار دینا محض خوش عقیدگی کی بات نہیں ہے بلکہ ایک حقیقی صورتحال کی تقابلی وضاحت کی اچھی کوشش ہے۔ کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ ولی کی شاعری سے پہلے لوگ اردو زبان کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ اس میں باضابطہ طور پر شاعری کریں۔ فارسی کا بڑا غلبہ تھا اور اشرافیہ طبقہ کے لوگ فارسی ہی کو علمی زبان سمجھتے تھے۔ فارسی زبان و ادب کا زبردست دبدبہ تھا۔ جو لوگوں کو اردو کو ہیچ سمجھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ ایسے ماحول میں ولی کا اردو زبان میں شاعری کرنا وہ بھی نہایت خود اعتمادی اور خلاقی کے بہترین جوہر کے ساتھ اپنے آپ میں ایک نادر مثال تھا۔ انہوں نے ہندوی یا دکنی ہندوی اور فارسی کے آمیزے سے ایک ایسی زبان کی تشکیل کی جو اردو کے نام سے جانی گئی اور اپنی شیرینی اور تازگی و توانائی کی وجہ سے بہت جلد دلوں پر راج کرنے لگی۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے ولی کے فکر و فن اور ثقافتی ورثے سے گہری وابستگی کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ولی جب دہلی آئے تو اپنے ساتھ اپنی ثقافت کا سرمایہ بھی ساتھ لائے، اس سرمائے میں ایرانی سکّے (IDIOMS) کم سے کم تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ ولی سے پہلے دکنی علاقے میں فارسی اور فارسی شاعری سے لوگ واقف نہیں تھے لیکن یہاں کے شعرا کی جڑیں اپنے لسانی نظام میں تھیں جو دوسرے لسانی نظام سے متصادم نہیں ہوئی تھیں۔ ادھر شمال میں بیرونی تسلّط کے سبب اشرافیہ ریختہ سے زیادہ فارسی پر زور دے رہا تھا، ولی کے پاس مقامی وراثت تو تھی ہی جب انہیں

ریختہ کہنے کی ہدایت کی گئی تو ان کے مقامی رنگ کو ایک اور سمت مل گئی، فارسی نے ان کی مدد کی اور شمال کے ڈکشن نے ان کے رنگ کو مزید چوکھا کر دیا، گویا اسلوب اور ڈکشن کا یہ منظر نامہ جو ولی کے یہاں ہے اس ثقافتی وسعت کا نتیجہ ہے جس کی جڑیں ہندوستان کے ایک وسیع علاقے سے لے کر ایران تک پھیلی ہوئی ہیں۔
(معنیٰ کی جبلت، ص:۱۱۱)

وہاب اشرفی نے ولؔی کے یہاں جس ہند ایرانی ثقافت کی بات کہی ہے اس کی خوشبو ولی کی شاعری میں پوری طرح رچی بسی ہوئی ہے جس کا اندازہ ان کی شاعری کے مطالعے سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ فی الوقت مثال کے لیے ایک شعر دیکھیے:

ترا مکھ مشرقی، حسن انوری، جلوہ جمالی
نین جامی، جبیں فردوسی و ابرو ہلالی

ظاہر ہے کہ جو شاعر اپنے محبوب کی خوبصورتی کی تعریف فارسی کے اہم شعرا فردوسی، جامی اور انوری وغیرہ کے تخلص کو تشبیہ میں بدل کر کرتا ہو، اسے ہند ایرانی تہذیب اور فارسی زبان و ادب کا کتنا گہرا شعور ہوگا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ غالباً ولی کی انہی حیرت انگیز خوبیوں کی وجہ سے نیا پرانا غرض ہر عہد کا بڑے سے بڑا اور اہم ناقد اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی تاریخ ادب اردو میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''یہ بات یاد رہے کہ آگے چل کر جتنے رجحانات نمایاں ہوئے وہ خواہ عشقیہ شاعری کا رجحان ہو یا ابہام پسندی کا لکھنوی شاعری کی خارجیت اور مسی چوٹی والی شاعری ہو مسائل تصوف کے بیان والی شاعری ہو یا ایسی شاعری ہو جس میں داخلیت اور رنگا رنگ تجربات کا بیان ہو یا اصلاح زبان و بیان کی تحریک ہو سب کا مبدا ولؔی ہے۔''

شمس الرحمٰن فاروقی کا ایک اقتباس پروفیسر خالد محمود نے نقل کیا ہے:

ولؔی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قطعی طور پر اور ہمیشہ کے لیے ثابت کر دیا کہ گجری اور دکنی کی طرح ہندی/ ریختہ میں بھی بڑی شاعری کی صلاحیت ہے۔ ولی نے یہ بھی دکھا دیا کہ ریختہ/ ہندی میں یہ بھی قوت ہے کہ وہ سبک ہندی کی فارسی شاعری پر فوقیت لے جاسکتی ہے یا کم سے کم اس کے شانہ بشانہ تو چل ہی سکتی ہے۔ تشبیہ اور پیکر کی نفاست ہو یا استعارے کی وسعت تجرید اور پیچیدگی مضمون آفرینی ہو یا معنیٰ آفرینی ریختہ/ ہندی فارسی سے ہرگز کم نہیں۔ ان کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے اردو کے شعرا کو ایک نئی شعریات کے احساس اور وجود سے آشنا کیا۔ اس شعریات میں سنسکرت، سبک ہندی اور دکنی تینوں کے دھارے آکر ملتے ہیں۔''

ڈاکٹر شارب ردولوی نے ''مطالعہ ولی تنقید و انتخاب'' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''سادگی روانی رنگینی سرخوشی نشاطیہ کیفیت تشبیہات و استعارات کی جدت معنیٰ آفرینی تاثرات حسیت، متنوع رمزیت اور ہندوستانی عنصر و فارسی کا خوبصورت امتزاج ولی کا فن ہے۔ جس سے ان کے کلام کا بیشتر حصہ روشن ہے۔''

ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں:

حق یہ ہے کہ حکیمانہ گہرائی دردمندی اور سوز و گداز کی کمی کے باوجود ان کا کلام بڑا خوش رنگ و خوش گوار ہے۔ بہار آفریں الفاظ خوب صورت تراکیب گل وگلگشت کی تکرار حسن کے ترانے اور نغمے مناسب بحروں کا انتخاب اور اسالیب فارسی سے گہری واقفیت اور ان سے استفادہ ان سب باتوں نے ولی کو ایک بڑا رنگین شاعر بنا دیا ہے۔

عابد علی عابد تو پوری اردو شاعری کے تناظر میں صرف ولی ہی کو کلاسیک قرار دیتے ہیں۔ بہرحال ان اقوال و اقتباسات سے اتنا تو واضح ہو ہی جاتا ہے کہ اردو کے تقریباً تمام اہل فکر و نظر ولی کی عبقریت کو تسلیم کرتے ہیں اور ان کی شاعرانہ انفرادیت کے قائل ہیں۔ اس کے باوجود کہنا پڑتا ہے کہ ولؔی پر جتنا اور جس نوعیت کا کام ہونا چاہیے نہیں ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر ولی پر ایسا بھرپور مقالہ بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے جس کے پڑھنے کے بعد تشنگی کا احساس نہ ہوتا ہو۔ حالانکہ ولی کی عظمت اور استادی کو تذکرہ نگاروں، محققوں اور ناقدوں کے علاوہ شعرا نے بھی سلام کیا ہے اور کئی اہم شعرا نے ان سے فیضیاب ہونے کا بھی اعتراف کیا ہے اس کے باوجود مطالعۂ ولی کے باب میں کہیں نہ کہیں ایک آنچ کی کمی محسوس ہوتی ہے، لیکن ان باتوں سے پہلے آیئے یہ دیکھتے چلیں کہ شعرا نے کس طرح ولی کی استادی کا اعتراف کیا ہے اور اس کی تقلید کو کیوں کر باعث افتخار سمجھا ہے۔

داؤد اورنگ آبادی ولی سے اتنے متاثر تھے کہ وہ خود کو ولی ثانی کہا کرتے تھے۔ ایک شعر دیکھئے:

حق نے بعد از ولی مجھے داؤد
صوبہ شاعری بحال کیا

حاتم نے ''دیوان زادہ'' کے دیباچے میں ولی کے مقابلے اپنی کمتری کا برملا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

حاتم بھی اپنے دل کی تسلی کوں کم نہیں
لیکن ولی ولی ہے جہاں میں سخن کے بیچ

شاہ مبارک آبرو جو اپنے وقت کے اہم شعرا میں شمار ہوتے ہیں انہوں نے بھی ولی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

آبرو شعر ہے ترا اعجاز
جوں ولی کا سخن کرامت ہے

سراج اپنی عشقیہ شاعری کے لیے بہت ہی ممتاز سمجھے جاتے ہیں اور وارفتگی

وسرشاری کے معاملے میں ولی سے بھی افضل قرار دیے جاتے ہیں وہ بھی ولی کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں:

تجھ مثال اے سراج بعد ولی
کوئی صاحب سخن نہیں دیکھا

خدائے سخن میر تقی میر جن کی عظمت کا ہر کوئی قائل ہے اور جو اپنے مقام و مرتبہ سے پوری طرح واقف ہیں اور کہتے ہیں:

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

وہ بھی ولی کی استادی کا اقرار کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

خوگر نہیں کچھ یونہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

غالباً انہی وجوہات کے پیش نظر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو جلد اول صفحہ ۵۸۹ میں لکھا ہے:

''ولی نے قدیم ادب کی روایت کے زندہ عناصر کو اپنے تصرف میں لا کر فکر و اظہار کی سطح پر ایک نیا معیار قائم کیا جو ریختہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ وہ نئی سطح تھی جہاں شمال جنوب، اور سارے برّ اعظم کے تخلیقی ذہنوں کی آرزوئیں تکمیل پا رہی تھیں، ولی کا یہ معیار ریختہ اتنا مقبول ہوا کہ سورت کے عبدالولی، عزلت، دکن کے داؤد، سراج گجرات کے یوسف زلیخا والے امین، پنجاب کے ناصر علی سرہندی اور شاہ مراد، سندھ کے میر محمود صابر، سرحد کے عبدالرحمان بابا، بہار کے عبدالقادر بیدل، دہلی کے فائز، جعفر زٹلی، آبرو، شاہ حاتم، کرناٹک کے شاہ تراب، مدراس کے محمد باقر آگاہ اور برّ عظیم کے طول و عرض میں چھوٹے بڑے سب شاعروں نے اس نئے معیار کو واحد ادبی معیار کے طور پر تسلیم کر لیا۔

مگر یہ تصویر کا ایک رخ ہے، یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ولی اردو کے پہلے شاعر نہیں ہیں، تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ولی اردو کی شعری روایت سے متاثر نہ ہوئے ہوں اور اپنے پیش روؤں اور ہمعصروں کا اثر قبول نہ کیا ہو، مگر ہندوستان کا شروع سے یہ مزاج رہا ہے کہ وہ ایک بار کسی کو بڑا یا عظیم مان لیتا ہے تو پھر اس کی شخصیت کے ان تمام پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتا ہے جو بر بنائے انسان دوسروں سے متاثر ہوتا ہے اور دوسروں کا اثر قبول کرتا اور اپنی شخصیت کی تکمیل کی کوشش کرتا ہے۔ کچھ ایسا ہی ولی کے ساتھ بھی ہوا۔

جمیل جالبی نے یہ تو لکھ دیا کہ دنیائے اردو ادب کے سبھی نابغوں نے ولی سے فیض پایا اور اس کے لسانی تفاعل اور تخلیقی تناؤ اور جدت و ندرت سے تحریک حاصل کی اور اپنے اپنے فن کا چراغ جلایا اور موقع ملا تو ان ہی کی زمین میں طبع آزمائی بھی کی اور اکثر و بیشتر ان کے خیالات کو بھی برتنے کی کوشش کی جس کی مثال کے لیے پوری اردو شاعری کی تاریخ سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر مثالیں پیش کی گئیں اور آج بھی کی جا رہی ہیں۔ اس مضمون میں بھی اس طرح کی درجنوں مثالیں پیش کی جائیں گی، مگر اس سے پہلے یہ بتا دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خود ولی نے بھی اپنے پیش روؤں اور ہمعصروں کا اثر قبول کیا اور حتی المقدور ان سے فائدہ بھی اٹھایا۔ چند اشعار دیکھئے:

خبر لیا یا ہے ہدہد میرے تئیں اس پار جانی کا
خوشی کا وقت ہے ظاہر کروں رازِ نہانی کا
(محمد قلی قطب شاہ)

الٰہی رکھ مجھے تو خاک پا اہل معانی کا
کہ کھلتا ہے اسی صحبت سوں نسخہ نکتہ دانی کا
(ولی)

تجھ خال ہے رخسار میں یا ہے بھنور گلزار میں
یا مصر کے بازار میں زنگی کھڑا زنگ بار کا
(حسن شوقی)

سنگاتی سات نئیں میرا موا سنگار کیا کرنا
مسی ہور پان خوشبوئی پھلوں کا ہار کیا کرنا
(نصرتی)

نین تجھ مدبھرے دیکھت نظر میانے اثر آوے
ادھر کے یاد کرنے میں زباں اوپر شکر آوے
(مشتاق)

اے سروِ گل بدن تو ذرا ٹک چمن میں آ
جیوں گل شگفتہ ہو کو مری انجمن میں آ
(تاناشاہ)

عاشق ہے جن تج لعل کا اس مال و دھن سوں کیا غرض
ہے کام جس کو روح سوں اس کو بدن سوں کیا غرض
(غواصی)

تج ادھر مئے شوق سوں چاکیا سو متوالا ہوا
آزاد مستاں ہوئے کر چھٹ سب سوں نروالا ہوا
(شاہ سلطان)

تجھ مکھ پہ یو تل دیکھ کر لالے کا دل کالا ہوا
دور خط سوں طوق جیوں مہتاب کا بالا ہوا
(ولی)

اس طرح کی اور بھی مثالیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب قطعی نہیں ہے کہ ولی اہم یا عبقری شاعر نہیں ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ

بزرگ آرٹ محرک ہوتا ہے اور اس چراغ سے کتنے ہی چراغ روشن ہوتے ہیں جو تخلیق فن کی راہوں کو اجالنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بزرگ فن کے اثرات سے آلودہ اور آسودہ کوئی بھی فن پارہ اور فن کار کم سواد نہیں سمجھا جاتا ہے۔ رہی بات ولؔی کی تو ان کی عظمت کا ایک زمانہ قائل ہے جب کہ خود ولؔی کو بھی اپنی شعری انفرادیت اور تخلیقی ثروت مندی، اور فنکارانہ ہنرمندی کا خوب خوب احساس تھا، وہ اپنی لسانی ندرت کاری اور سخن طرازی کی تازگی سے بھی آگاہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ خدائے سخن میر تقی میر کی طرح ان کے یہاں بھی بکثرت تعلّی کے اشعار پائے جاتے ہیں۔ نمونتاً یہ شعر دیکھیے:

اے ولی لگتا ہے ہر دل کو عزیز
شعر تیرا بسکہ شوق انگیز ہے

ایسا شاعر جس کی استادی کے سامنے بڑے سے بڑے شعرا و ادبا کی نظریں جھک جاتی ہوں، ان کی شعری کائنات میں داخل ہونا اور ان کی تخلیقی جہتوں کی دریافت اور بازیافت میں اپنے فہم وادراک کا ثبوت پیش کرنا اور اردو شاعری میں ان کی اولیات کی نشاندہی کرنا آسان نہیں ہے۔ کیوں کہ اس بے حد توانا، منفرد اور متنوع شاعر کے کلام کے کتنے ہی رنگ ایسے ہیں جنہیں آسانی سے گرفت میں نہیں لیا جاسکتا ہے اور نہ ان کی شاعری کی تمام جہات کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ ہاں ان کے کلام کو والہانہ ذوق وشوق سے پڑھنے، سمجھنے اور ان سے حظ اٹھانے کی ایک طالب علمانہ کوشش ضرور کی جاسکتی ہے اور اسی کوشش کا نتیجہ ہے یہ مضمون۔

پروفیسر خالد محمود نے اپنے اہم مضمون ''ولی کی عظمت'' نئی کتاب۔ اپریل جون ۲۰۱۰ء میں لکھا ہے:

''ولؔی پر تا حال جو تحقیقی اور تنقیدی کام ہوا ہے اس میں ولی کا نام، مقام پیدائش، وفات، اسفار، خصوصاً سفر دلی دوران سفر دلّی شاہ سعداللہ گلشن سے ولی کی ملاقات اور شاہ صاحب کا ولؔی کو فارسی آمیز شعر کہنے کا مشورہ یا دیوان ولؔی کی دلّی آمد کے تعلق سے بحث زیادہ ملتی ہے اور ان کی شاعرانہ خصوصیات کا ذکر استحقاق سے بہت کم ہے۔''

اور یہ بات کچھ بہت غلط بھی نہیں ہے کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بیشتر لوگ انہی متنازع موضوعات پر لکھتے ہیں اور کسی خاص نتیجہ پر پہنچے بغیر بات ختم کردیتے ہیں، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ لوگ ولؔی کی شاعری کی خوبیوں پر لکھتے ہی نہیں ہیں۔ یا یہ کہ لکھا ہی نہیں ہے۔ لکھا ہے، مگر ظاہر ہے کہ ولی کا جو مرتبہ ہے۔ اس حساب سے کم لکھا ہے۔ اس لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ ولی کے فن کی خوبیوں، لطافت اور ان کے لہجے کی رنگینی اور شیفتگی اور داخلی وخارجی خصوصیات کی عملی شناخت پر توجہ کی جائے۔ کیوں کہ یہی وہ چیزیں ہیں جس نے ولؔی کو ولؔی بنایا ہے۔

ولؔی کے شعری سرمائے میں یوں تو تمام ہی اصناف شاعری کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ مگر وہ عام طور پر غزل ہی کے شاعر کی حیثیت سے یاد کیے جاتے ہیں اور اتنی بات تو ہم سبھی جانتے ہیں کہ غزل ایجاز واختصار اور ایمائیت کا فن ہے۔ یہ ایسی صنف شاعری ہے جس میں بڑی سے بڑی بات اشارے اور کنائے میں بیان کردی جاتی ہے۔ جب کہ لطف کلام کے لیے مختلف النوع صنعتوں کا بھی خوب خوب استعمال کیا جاتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو غزل کو اردو اصناف ادب میں سب سے ممتاز اور مکمل صنف قرار دیتی ہے۔

ولؔی چوں کہ اردو کے ممتاز ترین شعرا میں سے ایک ہیں اس لیے ان کی شاعری میں وہ تمام چیزیں مل جاتی ہیں جن کا ہونا کسی بھی اچھی شاعری کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔

صنعت ایہام کی چند مثالیں دیکھیے:

پری رویان کے کوچہ میں خبرداری سوں جا اے دل
کہ اطراف حرم میں ڈر ہمیشہ ہے حرامی کا

یہاں پر ''حرامی'' کے لفظ سے چور کا معنی مراد لیا گیا ہے۔ لیکن ''حرم'' کے لفظ کی وجہ سے ذہن ''حرام'' یا ''حرامی'' کی جانب جاتا ہے۔ یہ شعر ایہام تناسب کی عمدہ مثال ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر غیر مناسب نہیں ہوگا کہ ایہام ہی وہ صنف ہے جس نے ولی کے عہد کی دلّی اور اطراف دلّی کے اساتذۂ سخن کو اتنا متاثر کیا کہ پورا دور ہی ایہام پرستی کے نام سے منسوب ہوگیا، مگر ولؔی نے یہاں بھی توازن قائم رکھا اور شعریت کو مجروح نہیں ہونے دیا، غالباً اسی وجہ سے محمد حسین آزاد نے لکھا ہے:

''ولؔی نے اپنے کلام میں ایہام اور الفاظ ذومعنین سے اتنا کام نہیں لیا، خدا جانے ان کے قریب العہد بزرگوں کو پھر اس قدر شوق اس کا کیوں کر ہوگیا۔''

(آب حیات، مطبوعہ لاہور، ۱۹۵۰ء، ص: ۸۷)

آزاد کے اس قول سے ایک طرح کی حیرت زائی مترشح ہے۔ یعنی جب تمام شعرا ولؔی کی استادی کے قائل ہیں تو پھر ان کے برعکس ایہام گوئی میں اس قدر کیوں مصروف ہیں کہ شعر اور شعریت کی حرمت کا پاس نہیں ہے۔

ولؔی نے عام طور پر ایہام گوئی سے شعر میں حسن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اکثر وبیشتر کامیاب رہے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

موسیٰ جو آ کے دیکھے تجھ نور کا تماشا
اس کو پہاڑ ہووے پھر طور کا تماشا

نہ جانوں خط ترا کس بے خطا پر
چلا ہے آج فوج شام لے کر

گرچہ لچھمن ترا ہے رام ولے
اے سجن تو کسی کا رام نہیں

ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے صنعت گری پر شعریت کو قربان نہیں کیا ہے۔ چند اور اشعار دیکھیے:

تعریف ترے قد کی الف دار سری جن
جاسر و گلستان کوں خوش الحان سے کہوں گا

ترے عشق نے خم کیا ہے مجھے
مرے حال پر زلف تیری ہے دال

پہلے شعر میں ''الف وار'' کے دو معنیٰ ہیں ایک الف کی طرح سیدھا (براہ راست) جا کر کہنا اور دوسرے شروع سے آخر تک یعنی پوری داستان بیان کرنا، یہاں پر مکمل طور سے کہنا مراد لیا گیا ہے۔ دوسرے شعر میں لفظ ''دال'' قابل توجہ ہے، دال کے دو معنیٰ ہیں، ایک حرف ''د'' کی طرح خمیدہ ہونا اور دوسرے دال، یعنی دلیل اور یہاں پر دلیل یا ثبوت کے معنیٰ مراد لیے گئے ہیں۔ ولی کے یہاں ایہام والے اشعار میں ابتذال بہت ہی کم پایا جاتا ہے۔ یہ بھی ان کی انفرادیت کا ثبوت ہے، ولی نے رعایت لفظی سے بھی خوب خوب کام لیا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

یوں تل تجھ مکھ کے کعبہ میں مجھے اسود حجر دستا
زنخداں میں ترے مجھ چاہ زمزم کا اثر دستا

کثرت کے پھول بن میں جاتے نہیں ہیں عارف
بس ہے موحّداں کوں منصور کا تماشا

پروانہ ہو کے کیوں نہ گرے چاند چرخ سوں
فانوس دل میں شوق ترا ہے سراج آج

پہلے شعر پر توجہ کریں تو معلوم ہوگا کہ کعبہ، حجر اسود اور زمزم میں بڑا قریبی لفظی تناسب ہے جب کہ تل، مکھ اور زنخداں میں بھی رعایت لفظی موجود ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں کثرت، عارف، موحد، منصور، سب کے سب الفاظ تصوف سے متعلق ہیں اور آپس میں کوئی نہ کوئی تعلق ضرور رکھتے ہیں۔ جب کہ تیسرے شعر میں پروانہ، گرنا، فانوس اور سراج ایک طرف اور چاند اور سراج دوسری طرف ایک دوسرے سے متناسب ہیں۔ رعایت لفظی کی مثالوں سے ولی کا کلام بھرا پڑا ہے۔

پروفیسر خالد محمود کہتے ہیں:

''لفظی اور معنوی رعایتوں اور مناسبتوں کا ولی کے کلام میں ایک جال سا بچھا ہوا ہے جس میں تجنیس کی بعض مثالیں تو ایسی غیر معمولی ہیں کہ کسی اور جگہ ان کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ آگے چل کر انہوں نے ولی کے اس شعر:

سراپا بدن گل کے پانی ہوا
ترے غم سے جیوں شبنم اے گل بدن

کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے:

ولی کا یہ بظاہر سادہ سا شعر رعایت لفظی کی گلکاریاں اور معنوی کرشمہ سازیوں کا حیرت انگیز نمونہ ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ ولی کے یہاں تمام صنعتوں کا بہت ہی خوبی سے استعمال ہوا ہے۔

حسن تعلیل کی مثال دیکھیے:

ماہ کے سینے اپرا ے ماہ رو
داغ ہے تجھ حسن کی جھلکار کا

مشرق سوں مغرب لگ سدا پھرتا ہے ہر ہر گھر و لے
اب لگ سُرج دیکھیا نہیں ثانی ترا آفاق میں

کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ حسن تعلیل ایسی صنعت ہے جس میں کسی چیز کی ایک ایسی علت فرض کر لی جاتی ہے جو دراصل اس کی علّت نہیں ہوتی۔

مراعات النظیر کی مثالیں دیکھیے:

آج کی رین مجھ کو خواب نہ تھا
دونوں انکھیاں میں غیر آب نہ تھا

تجھ حسن آب دار کی تعریف کیا لکھوں
موتی ہوا ہے غرق تجھے دیکھ آب میں

صنعت تضاد کی مثالیں بھی ولی کے یہاں بکثرت ملتی ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

جاتا ہے دن تمام اسی مکھ کی یاد میں
ہوتا ہے فکر زلف میں احوال شب عجب

نہ ہوئے اسے جگ میں ہرگز قرار
جسے عشق کی بے قراری لگے

پہلے شعر میں تضاد کی ایجابی صورت اور دوسرے شعر میں تضاد کی انحرافی صورت واضح ہے۔ صنف تضاد کی چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں:

ہجر کی زندگی سوں موت بھلی
کہ جہاں سب کہیں وصال ہوا

دو رنگی سوں تری اے سرورعنا
کبھو راضی کبھو بے زار ہیں ہم

مکھ ترا جیو روز روشن زلف تیری رات ہے
کیا عجب یہ بات ہے اک ٹھار دن ہور رات ہے

صنعت ردالعجز علی الصدر کی مثال کے لیے ولی کی ایک مکمل غزل ہے جو بہت ہی مشہور ہے، چند اشعار دیکھیے :

بے وفا گر تجھ کو بولوں ہے بجا اے نازنیں
نازنیں عالم منیں ہوتے ہیں اکثر بے وفا

کم نما ہے نوجواں میرا برنگ ماہ نو
ماہ نو ہوتا ہے اکثر اے عزیزاں کم نما

کیمیا عاشق کے حق میں ہے نگاہ گل رخاں
گل رخاں سوں جگ میں پایا ہوں ولی یہ کیمیا

سراپا نگاری بھی غزل کی اہم صنعتوں میں شمار کی جاتی ہے۔ ولی کے یہاں سراپا نگاری کی بڑی عمدہ عمدہ مثالیں بکھری پڑی ہیں۔ ایک دو مثال ملاحظہ ہو:

قد ترا رشکِ سروِ رعنا ہے
معنیٔ ناز کی سراپا ہے
تجھ بھواں کی میں کیا کروں تعریف
مطلع شوخ و رمز و ایما ہے
چمن حسن میں نگہہ کر دیکھ
زلف معشوق عشق پیچاں ہے
کیوں نہ مجھ دل کو زندگی بخشے
بات تیری دمِ مسیحا ہے
اس کے پیچاں کا کچھ شمار نہیں
زلف ہے یا موج دریا ہے

ولی کی یہ غزل حسرت کی مشہور زمانہ غزل مسلسل ''چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے'' یا پھر جگر کی غزل مسلسل، یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں، یہ آ رہے ہیں، وہ جا رہے ہیں وغیرہ سے کہیں زیادہ معنیٰ خیز سراپا انگیز اور جذبات سے لبریز ہے۔ ناز نخرے اور غصے سے تمتمائے محبوب کا جو پیکر ولی نے یہاں پیش کیا ہے اس سے لفظوں میں بھی ایک دبی دبی تپش پیدا ہو گئی ہے۔ غزل پڑھتے ہوئے قاری ولی کے تجربے میں پوری طرح شامل ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ ان کا تجربہ بڑا فطری اور حقیقی معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ولی کو تصوف سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ شاہ سعداللہ گلشن سے ان کی عقیدت اور پھر دکن کی ثقافت میں رچی بسی بھکتی تحریک کی خوشبو یہ سب ایسی چیزیں ہیں جس نے ولی کے تصوف رنگ مزاج کو جلا بخشنے میں اہم رول ادا کیا۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک زمانے میں دکن میں الواروں کی بھکتی کا بڑا چرچا تھا۔ جس کا عہد قبل از مسیح سے ہی شروع ہو جاتا ہے، اس بھکتی میں غلامی دوستی شفقت اور حسن کے جذبے کی بڑی آمیزش تھی اس لیے یہ گمان کرنا قطعی غلط نہیں ہوگا کہ ولی کے تصوف اور کلام میں جس طرح دوستی، شفقت، عشق اور حسن کے جذبے کی عکاسی ملتی ہے، اس میں اس بھکتی ثقافت کی تہذیب کی روح کا اثر ہے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رہنی چاہیے کہ جزوی طور پر ہی سہی ولی رامانند آچاریہ مادھوآ چاریہ۔

وشنوسوامی اور نمبارک اچاریہ وغیرہ سے ضرور واقف رہے ہوں گے، کہنے کو تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شمال و جنوب کی ثقافت اور لسانی برتاؤ میں جو فرق ہے۔ اس میں بھی اسی بھکتی تحریک کا رول ہے مگر ظاہر ہے کہ یہاں پر اس موضوع پر زیادہ گفتگو ممکن نہیں ہے، لیکن یہ تو کہا ہی جا سکتا ہے۔ کہ دکنی تہذیب کے پس منظر میں اردو شعرا کے یہاں جو محبت اور دلداری پائی جاتی ہے وہ اسی بھکتی تحریک سے حاصل شدہ وراثت کا فیض ہے۔

پروفیسر وہاب اشرفی صاحب کھلے لفظوں میں لکھتے ہیں:

''ولی کے یہاں جس طرح بیراگی، برہ، ساجن، رتھ پتھ، امرت، بچن، ہیکل اور ہلاس جیسے الفاظ بار پاتے ہیں۔ وہ الواری تصوف کے مختلف سلسلوں کی دین ہیں یہی تصوف پھیل کر ولی کے یہاں عشق بن گیا ہے۔ جو بھکتی اور تصوف کی مشترک میراث ہے۔''

(معنیٰ کی جبلت، ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۸ء، ص:۱۲)

اور یہ بات بہت حد تک درست ہے کیوں کہ ولی کے یہاں عشق حقیقی و مجازی کے حامل اشعار کی کوئی کمی نہیں ہے۔ چند اشعار دیکھیے :

سجن کے باج عالم میں دگر نئیں
ہمیں میں ہے ولے ہم کو خبر نئیں

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا
بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا

ہر ذرۂ عالم میں ہے خورشید حقیقی
یوں بوجھ کے بلبل ہوں ہر یک غنچہ وہاں کا

ولی کے یہاں عشق کا جو تصور ابھرتا ہے وہ بھی بہت توانا اور صحت مند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں محبوب کی جو حسی تصویر ابھرتی ہے وہ بڑی حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ ولی کی شاعری میں چوں کہ حسن و عشق کے تمام جلوے اور رنگ بکھرے ہوئے ہیں اور فنی سطح پر تشبیہات کی بھی ایک حسین کائنات پھیلی ہوئی ہے۔ اس لیے بعض اوقات تو ولی کی غزلیں رنگ و نور کی جگمگاتی ایک نہایت کشادہ شاہراہ معلوم ہوتی ہے۔ یہی وہ صورتحال ہے جس کے پیش نظر بعض لوگ انہیں محض حسن و عشق کا شاعر قرار دینے پر مصر نظر آتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ولی کی شاعری کسی ایک رنگ کی اسیر نہیں ہے۔ ان کے یہاں بلا کا تنوع پایا جاتا ہے اور اہم بات یہ ہے کہ ان کی شاعری کا ہر رنگ اور ہر پہلو اتنا توانا اور بھرپور ہے کہ جس پہلو پر نظر ڈالیں محسوس ہوتا ہے، ولی اسی رنگ کے شاعر ہیں۔ چوں کہ

ولی کی شاعری میں ہمارے جذبات کو انگیخت کرنے اور ہمارے محسوسات کو چھونے کی ایک انوکھی خوبی اور صلاحیت ہے۔ اس لیے ہم جب ان کی غزل کائنات میں داخل ہوتے ہیں تو ان کے بصری اور سمعی تلازموں سے آراستہ وادیٔ شعروسخن میں گم ہوکر رہ جاتے ہیں۔ ولؔی کی اس نوع کی شاعری پر توجہ کریں تو محسوس ہوگا کہ ان کے یہاں رنگوں کا خاص اہتمام پایا جاتا ہے۔ جب کہ سرخ اور سنہرے رنگ کو ایک طرح کا اختصاص حاصل ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

گل ہوئے غرق آپ شبنم میں
دیکھ اس صاحب ادا کی ادا

رشک سوں تجھ لباں کی سرخی پر
جگر لالہ داغ داغ ہوا

چوں کہ حسن اور عشق کا رنگ کسی ایک رنگ میں قید ہوکر نہیں رہ پاتا ہے۔ اس لیے ولی کے یہاں بھی محض انہیں دو رنگوں کی بہار نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے یہاں حسن وعشق اور محبوب زندگی کے ہر رنگ میں نظر آتا ہے۔ چند اشعار اور دیکھیے:

ہوا قد سرو کے مانند صنم کا
لباس سبز سوں سر تا قدم سبز

دیکھ اس کی کلاہ بارانی
چاند پر آج ابر آیا ہے

نام اس دو رنگے کا کیوں نہ ہو گل رعنا
چہرہ ارغوانی ہے جامہ زعفرانی ہے

حد تو یہ ہے کہ سیاہ رنگ جو عام طور پر غم وغصے کی علامت سمجھا جاتا ہے، ولؔی نے اس سے بھی محبوب کی تصویر کشی کا کام لیا ہے۔ شعر دیکھیے:

اے صنم تجھ جبیں اپر یہ خال
ہندوئے ہردوار باسی ہے
یہ سیہ زلف تجھ زنخداں پر
ناگنی جوں کنویں پر پیاسی ہے

ولی کے کلام میں تشبیہات بلکہ یوں کہیں کہ خوبصورت تشبیہات کے جال کا ہر کسی کو احساس ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جس طرح علم بیان میں تشبیہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، اسی طرح ولی کے کلام میں تشبیہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے تو قطعی مبالغہ نہیں ہوگا۔ کیوں کہ ولی کا کلام تشبیہات کا جیتا جاگتا سمندر معلوم ہوتا ہے۔ جب کہ دیکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ ولی کے کلام میں عقلی اور تخیلی تشبیہات کی بہ نسبت حسّی تشبیہات کی کثرت ہے جس سے محبوب کی ایسی خوبصورت تصویر بنتی ہے کہ ہر کوئی اس میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ولی کی مشہور زمانہ غزل تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا۔ کے علاوہ بھی سیکڑوں مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ مثلاً:

صنعت کے مصور نے صباحت کے صفحے پر
تصویر بنائی ہے تری نور کو مل کر

کیا ہوسکے جہاں میں ترا ہمسر آفتاب
تجھ حسن کی اگن کا ہے اک اخگر آفتاب

تجھ مکھ کی جھلک دیکھ گئی جوت چندرسوں
تجھ مکھ پہ عرق دیکھ گئی آب گہر سوں

جگ دو جا نہیں ہے خوب رو تجھ سار کا
چاند کوں ہے آسماں پر رشک تجھ رخسار کا

تشبیہوں اور استعاروں کی مدد سے ولی نے محبوب کی جو تصویر کشی کی ہے وہ بھی ان کے فنکارانہ کمال کی دلیل ہے، ویسے ولی نے اپنے حال دل اور عشق بے داد کی جو کہانی اپنے اشعار میں بیان کی ہے اس میں ایک خاص طرح کی شائستگی پائی جاتی ہے۔ یعنی ان کے یہاں محبوب کے جسم کے خطوط کی پیرا کی اور بوالہوسی کے بجائے ایک جیتے جاگتے حیادار اور عزت دار محبت کا عکس نمایاں ہوتا ہے۔ یہی چیز ان کے عشقیہ معاملات کو گوارہ خاطر بناتی ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

ہے منت شراب ہوں سرشار انبساط
تجھ نین کا خیال مجھے جام جم ہوا
ہر درد پر کر صبر ولی عشق کی رہ میں
عاشق کو نہ لازم ہے کرے دکھ کی شکایت
قرار نہیں ہے مرے دل کوں اے سجن تجھ بن
ہوئی ہے دل میں مرے آہ شعلہ زن تجھ بن

اس طرح واضح ہوجاتا ہے کہ ولی کی شاعری میں حسن وعشق کا جو تصور ملتا ہے وہ مجرد اور خیالی نہیں ہے اور نہ اس میں وہ بے اعتدالی اور سطحیت ہے جو آگے چل کر محمد شاہی دور کے اکثر شعرا کے یہاں نظر آتی ہے اور لکھنوی تہذیب کے تناظر میں چوٹی مسی کی شاعری کہلاتی یا خارجیت کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔

ولی کی تخلیقی انفرادیت اور فنکارانہ کمال کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ بعد کے تقریباً تمام بڑے شعرا نے ان سے کسی نہ کسی سطح پر کسب فیض ضرور کیا ہے۔ ایک آدھ مثالیں دیکھئے۔ ولؔی کا ایک شعر ہے:

بات کہنے کا کبھی جب وقت پاتا ہے غریب
بھول جاتا ہے وہ سب دیکھ صورت یار کی

میر کہتے ہیں:

کہتے تھے کہ یوں کہتے یوں کہتے وہ جو آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

غالب نے کہا:

آج ہم اپنی پریشانی خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

امیر مینائی کہتے ہیں:

یہ کہوں گا یہ کہوں گا یہ ابھی کہتے ہو
سامنے ان کے بھی جب حضرت دل یاد رہے

داغ کے یہاں تو پورا مصرع ہی لڑ گیا ہے:

یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم
بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت تیری

ولی کا ایک اور شعر ہے:

رات دن جگ میں رفیق بے کساں
بے کسی ہے بے کسی ہے بے کسی

اسی خیال کو درد نے اس طرح باندھا ہے:

آنکھیں بھی ہائے نزع میں اپنی بدل گئیں
سچ ہے کہ بے کسی میں کوئی آشنا نہیں

امیر مینائی نے کہا:

پتلیاں تک بھی تو پھر جاتی ہیں دیکھ دم نزع
وقت پڑتا ہے تو سب آنکھ چرا جاتے ہیں

غالب نے اسی بات کو دوسرے انداز میں کہا ہے اور کہنا چاہیے کہ خوب کہا ہے:

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کے رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

مومن کا شعر ہے:

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں
اے ہمنشیں نزاکت آواز دیکھنا

شاہ حاتم کا بھی ایک شعر اسی نوعیت کا ہے۔ دیکھیے:

حق میں عاشق کے تجھ لباں کے بچن
قند ہے، نیشکر ہے، شکر ہے

ولی کا ایک مشہور مطلع ہے:

خوب رو خوب کام کرتے ہیں
یک نگہ میں غلام کرتے ہیں

ولی کی مشہور زمانہ غزل کا مطلع ہے:

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا
جادوں ہیں ترے نین غزالاں سوں کہوں گا

آبرو نے اسی مطلع پر ایک خوبصورت مطلع کہا ہے:

بے تابی دل آج میں دلبر سوں کہوں گا
ذرّے کی تپش لہر منوّر سوں کہوں گا

چوں کہ یہ بات طے ہے کہ دلّی والوں نے ولی کا دیوان دیکھ کر ہی اردو دیوان کی طرف توجہ کی اس لیے بیشتر شعرا نے ولی کی خوشہ چینی میں بھی کوئی تکلف نہیں محسوس کیا۔

ولی کا ایک شعر ہے:

پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا
شاید کہ مرا حال اسے یاد نہ آیا
مجھ پاس کبھی وہ قد شمشاد نہ آیا
اس گھر منے وہ دلبر استاد نہ آیا

(فائز)

یہ ٹھیک ہے کہ بہت سارے معاملات میں ولی کو اولیت حاصل ہے اور بیشتر شعرا نے ان سے استفادہ کیا ہے مگر یہ بھی درست ہے کہ کئی شعرا نے بالخصوص میر نے غزل کو اگلے پڑاؤ تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اور ولی سے زیادہ روشن لکیر کھینچی ہے، ولی کا ایک شعر ہے۔

ہوں گرچہ خاکسار ولے از رہِ ادب
دامن کو تیرے ہاتھ لگایا نہیں ہنوز

اب میر کا شعر دیکھئے جو ولی سے بہر حال بلند ہے:

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

ولی نے اپنے ایک شعر میں زندگی کا فلسفہ پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ شعر دیکھیے:

یو بات عارفاں کی سنو دل سے سالکاں
دنیا کی زندگی ہے یو وہم و گمان محض

اسی خیال کو مرزا غالب نے بھی باندھا ہے اور خوب باندھا ہے۔ شعر دیکھیے:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

اگر کسی خیال کو بعد کے کسی شاعر نے ولی سے بہتر انداز میں پیش بھی کیا ہو تو اس سے ولی کی عظمت اور اولیت پر کوئی حرف نہیں آتا ہے۔ کیوں کہ نقش اول ہمیشہ مشکل اور تخلیقی نوعیت کا ہوتا ہے۔ جب کہ نقش ثانی بہت کچھ توسیعی اور کسی حد تک نقالی کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ولی کے یہاں ایسی تخلیقی توانائی پائی جاتی ہے۔ جس سے ہر زمانے کا فنکار اپنی استطاعت کے مطابق فیض پاتا رہے گا۔

○○